اقبال کی نظم میں اصناف سخن

جگن ناتھ آزاد

کلام اقبال کی دلکشی اور دلآویزی نے جہاں میرے وجدان کو ایک عجیب و غریب کیفیت لذت سے آشنا کیا ہے وہاں اس دلکشی اور دلآویزی نے میرے لیے مطالعہ کلام اقبال کے راستے میں بعض رکاوٹیں بھی پیدا کر دی ہیں ۔ میں نے شعر اقبال میں ہیت اور مواد یا دوسرے لفظوں میں فن اور فکر کو ہمیشہ ایک اکائی کے طور پر دیکھا ہے اور کلام اقبال کے کیف و سرمستی نے کبھی اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ میں اقبال کے یہاں فارم (form) کو کنٹینٹ (content) سے الگ کرکے دیکھوں ، حالانکہ شاعر اقبال کے مطالعے کے لیے فن کو فکر سے الگ کرکے پرکھنا بھی ضروری ہے خواہ وہ فکر کلام اقبال میں آ کر فکر محسوس ہی کیوں نہ بن گیا ہو ۔

میں پروفیسر آل احمد سرور کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے اب کے پھر مجھے ایک ایسا موضوع دیا ہے جس کے بارے میں مجھے دو ایک بار خیال تو آیا لیکن اس پر لکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی ۔

اقبال اور اصناف نظم کے موضوع پر بات چیت کرنے کے لیے سب سے پہلا سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے یہ ہے کہ اقبال نے اپنی نظم میں کس کس صنف کو استعمال کیا ہے ۔ اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ کس صنف کے ساتھ اقبال کا کس طرح کا تعلق خاطر یا مزاجی ربط رہا اور اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں ۔ ان سوالات کے ساتھ ہی ساتھ ایک ضمنی سی بات یہ بھی سامنے آتی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اصناف سخن کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک ہیت کے اعتبار سے دوسری موضوع کے اعتبار سے ۔ مثلاً ہیت کے اعتبار سے اصناف سخن ہیں مثمن ، مخمس ، مسدس ، مربع ، سبع ، قطعہ ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، رباعی ، مثنوی ،

مستزاد وغیرہ اور موضوع کے اعتبار سے اصناف سخن ہیں مرثیہ ، قصیدہ ، مزاحیہ کلام وغیرہ ـ اگرچہ قصیدہ ہیئتی اعتبار سے بھی ایک صنف سخن ہے ۔

یوں تو اس موضوع پر بحث کے لیے اقبال کے فارسی کلام کو اُردو کلام سے الگ نہیں کیا جا سکتا لیکن میں بوجوہ اپنے مقالے کو اقبال کے صرف اُردو کلام ہی تک محدود رکھوں گا اور جہاں تک اُردو کلام کا تعلق ہے میں نے یہ مناسب سمجھا ہے کہ بانگِ درا ، بال جبریل ، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کے حصہ اُردو کے علاوہ اقبال کا وہ کلام بھی پیش نظر رکھوں جو اقبال نے ان تصانیف میں شامل نہیں کیا کیونکہ اقبال کی مختلف اصناف سخن کے ساتھ ذہنی یا وجدانی ہم آہنگی کا ایک ارتقائی مطالعہ اس کے بغیر ممکن نہیں ۔

جب ہم اصناف نظم کو موضوع بنا کر کلام اقبال کا اول سے آخر تک مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ اقبال نے جن اصناف میں طبع آزمائی کی ہے وہ ہیں مسدس ، قطعہ ، مخمس ، مثنوی ، ترکیب بند اور رباعی ۔ اس فہرست میں اگر ہم گیت کی صنف کو بھی شامل کرنا چاہیں تو یہ بھی غلط نہ ہو گا ۔ قصیدے کا ذکر میں نے اس لیے یہاں نہیں کیا کہ قصیدہ اگرچہ بحثیت موضوع اپنی جگہ ایک مستقل صنف سخن ہے لیکن جہاں تک ہیئتی اصناف نظم کا تعلق ہے اقبال نے قصیدہ مسدس کی صورت میں بھی لکھا ہے اور ترکیب بند کی صورت میں بھی ۔ قصیدے کے بارے میں اہل علم کا یہ خیال کہ اب قصیدے کا دور گزر چکا ہے بڑی حد تک صحیح ہے (اگرچہ کسی نہ کسی انداز سے قصیدہ ہماری شاعری میں آج بھی باقی ہے) لیکن قصیدہ ہماری شاعری میں محض ایک مقصدی انداز کی نظم ہی کا نام نہیں ہے بلکہ بطور الگ پارۂ فن (piece of art) کے بھی اس کا مرتبہ بہت بلند ہے ، اور ہمارے اکثر شعراء محض قصیدے ہی کی وجہ سے شعر و سخن کی دنیا میں نہایت ہی ارفع مقام تک پہنچے ہیں ۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنی نظموں میں جن اصناف سخن کو برتا ہے اُن کے بارے میں یہ بیان کر دیا جائے کہ کون سی صنف کتنی بار اقبال کے یہاں آئی ہے ، تو یہ نقشہ یوں بنتا ہے : مسدس ۱۵ ، مربع ۱ ، ترکیب بند ۴۳ ۔ قطعات کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ ”بانگ درا میں قطعات کی تعداد ۶۱ ہے ، بال جبریل میں ۴۷ ، ضرب کلیم میں ۱۶۹

اور ارمغان حجاز میں ہے۔ متروک کلام میں بھی قطعات کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔ قصیدہ ۴ ، مخمس ۲ ، مراثی کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔ قصیدہ ۴ مخمس ۲ ، مراثی ۹ ، لیکن مراثی کی تعداد دوسری اصناف میں شامل ہے۔ مثلاً ملکہ وکٹوریا کا مرثیہ ترکیب بند ہے۔ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کو میں نے مثنوی کی صنف میں شامل کیا ہے ، اگرچہ اس پر بعد میں بات ہو گی کہ یہ مثنوی ہے یا نہیں۔ اسی طرح چار قصیدوں میں ایک مسدس ہے۔

اے تاجدار خطۂ جنت نشان ہند
روشن تجلیوں سے تری اختران ہند
محکم ترے قلم سے نظام جہان ہند
تیغ جگر شگاف تری پاسبان ہند
ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو

باقی تینوں قصیدے شکریہ دربار بھاول پور اور لاٹ صاحب اور اردو ڈائرکٹر کا خیر مقدم دونوں اعتبار سے قصیدے ہیں ، ہیئتی اعتبار سے بھی اور موضوعی اعتبار سے بھی۔

جہاں تک رباعی کا تعلق ہے بحر ہزج کے مروجہ زحافات میں اقبال نے اُردو میں صرف دو رباعیاں کہی ہیں۔

(۱)

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی

(۲)

تو قیس نہیں تو تجھ کو بن سے کیا کام
زر پاس نہیں تو راہزن سے کیا کام
مسلم کی بنائے قومیت ہے اسلام
مسلم ہے اگر تو تو وطن سے کیا کام

اور جہاں تک 'مفاعیلن مفاعیلن فعولن کا تعلق ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے بانگ درا اور ضرب کلیم تو بحر ہزج کے اس زحاف کی رباعیات سے خالی ہیں لیکن بال جبریل ان سے لبریز ہے اور چند رباعیات اس زحاف میں کہی ہوئی "ارمغان حجاز" (حصہ اُردو) میں بھی شامل ہیں۔[1] مزاحیہ انداز میں اقبال نے جتنا کچھ بھی کہا ہے، "بانگ درا" میں بھی اور متروک کلام میں بھی، وہ سب قطع کے انداز میں کہا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ قطعے کے لیے کوئی طے شدہ ہیت نہیں ہے سوائے اس شرط کے کہ مطلع کے بغیر ہو لیکن ہماری اُردو شاعری میں ایسے قطعات کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن میں مطلع شامل ہے اور ہم پھر بھی اُنہیں قطعہ ہی کہتے ہیں۔ مثنویوں کی تعداد ۵۰ تک پہنچتی ہے۔ مخمس صرف دو ہیں۔

اب اگر ہم صرف تعداد کو دیکھتے ہیں تو قطعات کی تعداد اقبال کی برتی ہوئی دوسری تمام اصناف سے زیادہ ہے۔ بابا طاہر عریاں کے تتبع میں کہی ہوئی رباعیات کی تعداد بھی کم نہیں ہو گی اگرچہ میں نے ان کی گنتی نہیں کی ہے اور ہمارے بعض عروضی حضرات ان رباعیات کو رباعیات کہنے سے انکار کرتے ہیں اور اُنہیں قطعات کہنے پر مصر ہیں۔ تو کیا اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ قطعہ ہی اقبال کی محبوب صنف سخن ہے۔ میرا خیال ہے یہ نتیجہ انتہائی غلط اندیشی پر مبنی ہوگا کیونکہ اقبال کے قطعات ہیئتی اعتبار سے متعدد اصناف سخن میں منقسم ہیں۔

تعداد کو پیش نظر رکھ کر جب ہم بات کرتے ہیں تو نگاہ مثنوی اور ترکیب بند پر جا کر ٹھہرتی ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مثنویوں کی تعداد اقبال کے یہاں ۵۰ ہے اور ترکیب بند کی ۳۶۔ مسدس کی تعداد پندرہ ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اسی صنف سخن میں شکوہ اور جواب شکوہ ایسے شاہکار موجود ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ جب ہم اقبال کے ابتدائی کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے جو قابل ذکر نظم ہمارے سامنے آتی ہے وہ بھی ایک مسدس ہی ہے۔ میری مراد "نالۂ یتیم" سے ہے۔ "نالۂ یتیم" پہلی نظم ہے جو اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ اجلاس (۱۹۰۰)

۱۔ ویسے "ارمغان حجاز" کی فارسی رباعیات تو سب کی سب اسی زحاف میں ہیں۔

میں پڑھی اور بقول غلام رسول مہر جس سے اُن کی شاعرانہ شہرت کا آغاز ہوا ۔ یہ وہی نظم ہے جسے سن کر صدر جلسہ مولانا نذیر احمد خان نے کہا تھا ''میں نے دبیر اور انیس کی بہت سی نظمیں سنی ہیں مگر واقعی ایسی دل شگاف نظم کبھی نہیں سنی'' ۔ یوں تو ایک مسدس ''ہمالہ'' اُسی زمانے کی نظم ہے لیکن ۱۹۰۱ء میں یعنی دوسرے برس اقبال نے جو نظم انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی وہ ایک ترکیب بند ہے ۔

اے مہ عید بے حجاب ہے تو
حسن خورشید کا جواب ہے تو

''نالہ یتیم'' ۱۰۵ اشعار کی نظم ہے اور ''یتیم کا خطاب ہلال عید سے'' ۱۵۰ اشعار کی ۔ گویا جہاں تک کسی صنف سے گہرے تعلق کا معاملہ ہے ، یہ دونوں اصناف ، مسدس اور ترکیب بند ، شروع شروع میں اقبال کی محبوب اصناف سخن تھیں ۔

''ہمالہ'' (مسدس) بھی ۱۹۰۰ یا ۱۹۰۱ کی نظم ہے جو ۱۹۰۱ء کے ''مخزن'' میں چھپی ۔ اس کے بعد گل رنگین ، عہد طفلی ، مرزا غالب اور ابر کوہسار (یعنی بانگ درا کی پہلی پانچوں نظمیں) مسدس ہیں اور متروک کلام کی چار خاص اہم نظمیں یعنی یتیم کا خطاب ہلال عید سے ، اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے ، ابر گہر بار ، یا فریاد اُمت اور برگ گل (بر مزار مقدس حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی) ترکیب بند ہیں ۔ اور یہ وہ نظمیں جن میں اس طرح کے اشعار آتے ہیں ۔

ہم سخن ہونے کو ہے معمار سے تعمیر آج
آئینے کو ہے سکندر سے سر تقریر آج
نقش کے نقاش کو اپنا مخاطب کر لیا
شوخی تحریر سے گویا ہوئی تصویر آج
سن کے کیا کہتی ہے دیکھیں یاد عنبر باد صبح
لب کشا ہونے کو ہے اک غنچۂ دلگیر آج
آج ہم حال دل درد آشنا کہنے کو ہیں
اس بھری محفل میں اپنا ماجرا کہنے کو ہیں
محفل عشرت میں ہے کیا جانے کس کا انتظار
آج ہر آہٹ کو ہم آواز پا کہنے کو ہیں

www.IqbalCyberLibrary.net All rights reserved ©2002-2006

اور یہ نعت اسی نظم ہی کا حصہ ہے

اے کہ بر دلہا رموز عشق آساں کردۂ
سینہ ہا را از تجلی بوستاں کردۂ
اے کہ صد طور است پیدا از نشان پائے تو
خاک یثرب را تجلی گاہ عرفاں کردۂ
اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز شمع نور عرفاں کردۂ
اے کہ ہم نام خدا باب دیار علم تو
آسیے بودی و حکمت را نمایاں کردۂ

(اسلامیہ کالج کا خطاب)

آسماں مجھ کو بجھادے جو فروزاں ہوں میں
صورت شمع سر گور غریباں ہوں میں
ضبط کی جا کے سنا اور کسی کو ناصح
اشک بڑھ بڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں ہوں میں
ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا
کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں
رند کہتا ہے ولی مجھ کو، ولی رند مجھے
سن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں
زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں
کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں
ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب آئے نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں
دیکھ اے چشم عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

(ابر گہر بار)

کیوں نہ ہوں ارماں مرے دل میں کلیم اللہ کے
طور در آغوش ہیں ذرے تری درگاہ کے

شان محبوبی ہوئی ہے پردہ دار شان عشق
ہائے کیا رتبے ہیں اس سرکار عالی جاہ کے
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا اثبات نفی غیر میں
لا کے دریا میں نہاں موتی ہیں الاّ اللہ کے
سنگ اسود تھا مگر سنگ فسان تیغ عشق
زخم میرے کیا ہیں دروازے ہیں بیت اللہ کے
محو اظہار تمنائے دل ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہوں

(برگ گل)

یہ ۱۹۰۳ تک کی تصویر ہے۔ ۱۹۰۴ء میں اقبال نے پھر ایک معرکہ آرا ترکیب بند لکھا جس کا عنوان ہے "تصویر درد"۔

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری۔یہ نظم اقبال نے اسی سال یعنی ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی لیکن انھی چند برسوں میں اقبال نے چند قطعات نما نظموں کے علاوہ چند مثنوی نما نظمیں بھی کہیں ، مثلاً ایک پہاڑ اور گلہری ، ایک گائے اور بکری ، بچے کی دعا ، ہمدردی ، ماں کا خواب ، پرندے کی فریاد ، خفتگان خاک سے استفسار ، شمع و پروانہ ، صدائے درد ، آفتاب ، شمع ، درد عشق ، گل پژ مردہ ، سید کی لوح تربت ، ماہ نو ، انسان اور بزم قدرت ، رخصت اے بزم جہاں اور طفل شیر خوار ۔ دو ایک مسدس بھی کہے ۔ آفتاب صبح اور موج دریا اور اگر آپ نظم بعنوان "شاعر" کو جو ایک ہی بند پر مشتمل ہے مسدس ہی سمجھیں تو گویا تین مسدس اور ایک چھوٹا سا ترکیب بند کہا جس کا عنوان ہے "عشق اور موت" ۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے اکثر قطعے جو "تصویر درد" سے پہلے کہے گئے یا بعد میں ، اس انداز کے ہیں کہ اگر ان میں ایک بند اور بڑھا دیا جاتا تو یہ ترکیب بند ہی بن جاتے لیکن یہ بات اتنی اہم نہیں جتنی یہ کہ "جواب شکوہ" کے بعد جو ۱۹۱۲ ہی کی نظم ہو سکتی ہے اقبال نے کوئی مسدس نہیں لکھا ، حالانکہ "جواب شکوہ" سے قبل شکوہ ، وطنیت اور نالۂ فراق ایسے مسدس وہ ہمیں دے چکے تھے ۔ یعنی اگر ہم اقبال کے متروک کلام کو پیش نظر نہ رکھیں اور ایک لحاظ سے رکھنا بھی نہیں چاہیے تو "جواب شکوہ" اقبال کا آخری مسدس ہے ۔ متروک

کلام کی بات یہ ہے کہ ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کے خاتمے پر اقبال نے نو بند کا ایک مسدس کہا جس کا عنوان ہے ''پنجاب کا جواب'' ۔ اس مسدس کی شان نزول یہ ہے کہ پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈ وائر نے جنگی کوششوں کو فروغ دینے کے لیے مشاعروں کا بھی انتظام کیا تھا ۔ اس سلسلے میں اُس نے اقبال سے بطور خاص نظم کہنے اور مشاعرے میں آکے پڑھنے کی فرمائش کی تھی ۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ ''زمانہ ایسا نازک تھا کہ اس فرمائش کو ٹالنے کی کوئی صورت نہ نکل سکتی تھی۔ لہذا اقبال نے نظم کہی اور خود مشاعرے میں جا کر پڑھی'' ۔ یہ نظم بقول مہر صاحب ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء کے ''وکیل'' امرتسر میں شائع ہوئی تھی ۔

تلوار تیری دہر میں نقاد خیر و شر
بہروز، جنگ توز، جگر سوز، سینہ در
رایت تری سپاہ کا سرمایۂ ظفر
آزادہ ، پر کشادہ ، پری زادہ ، سیم بر
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے
وقت آ گیا کہ گرم ہو میدان کارزار
پنجاب ہے مخاطب پیغام شہر یار
اہل وفا کے جوہر پنہاں ہوں آشکار
معمور ہو سپاہ سے پہنائے روز گار
تاجر کا زر ہو اور سپاہی کا زور ہو
غالب جہاں میں سطوت شاہی کا زور ہو

تو گویا متروک کلام کو اگر پیش نظر رکھیں تو یہ اقبال کا آخری مسدس ورنہ در اصل آخری مسدس جواب شکوہ ہے جو ۱۹۱۲ کی تخلیق ہے ۔

متروک کلام کا ذکر آ گیا تو دو چھوٹی چھوٹی مثالیں اور بھی پیش کر دینا نامناسب نہ ہو گا ۔ یہ مثالیں ہیں ترجمہ از ڈانگ اور ایک وید کا منتر کا ترجمہ ۔ یہ دونوں نظمیں صرف ایک ایک بند پر مشتمل ہیں ۔ یوں تو انھیں ہم قطعہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ہیں یہ دونوں مسدس کے فارم میں ۔ یہاں مشکل یہ ہے کہ مسدس کا فارم ہونے کے

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

باوجود ہم محض ایک بند کو مسدس کہیں بھی تو کیسے ۔ بہر طور وہ دونوں نظمیں یہ ہیں ۔

ترجمہ از ڈاٹک

دل شمع صفت عشق سے ہو نور سراپا
اور فکر یہ روشن ہو کہ آئینہ ہے گویا
نیکی ہو ہر ایک فعل کی نیت سے ہو پیدا
ہر حال میں ہو خالق ہستی پہ بھروسا
ایسی کوئی نعمت تہ افلاک نہیں ہے
یہ بات جو حاصل ہو تو کچھ باک نہیں ہے

وید منتر کا ترجمہ

خوشیوں سے ہو اندیشہ نہ غیروں سے خطر ہو
اصحاب سے کھٹکا ہو نہ اعدا سے حذر ہو
روشن مرے سینے میں محبت کا شرر ہو
دل خوف سے آزاد ہو بیباک نظر ہو
پہلو میں مرے دل ہو ہے آشام محبت
ہر شے ہو مرے واسطے پیغام محبت

اب اس سوال پر بحث کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کرتے ہوئے کہ اقبال نے یکلخت تخلیق مسدس سے کیوں اپنا رشتہ توڑ لیا اقبال کی باقی ماندہ دو محبوب اصناف سخن کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ اصناف سخن ہیں مثنوی اور ترکیب بند ۔ جہاں تک تعداد کا تعلق ہے اقبال کے یہاں مثنویاں چون ہیں اور ترکیب بند ۳۶ ہیں ۔ لیکن کسی شاعر کے وجدان اور اُس کی تخلیقی صلاحیتوں کی بات کرتے ہوئے اصناف کی یا مصرعوں کی یا حروف کی گنتی کرنا اور محض تعداد ہی کی بنا پر کسی نتیجے پر پہنچنا صحیح تنقیدی طریق کار نہیں ۔ یہ مشینی عمل اس اس ادبی جائزے سے دور ہی رہے تو اچھا ہے ۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تعداد میں فرق کے باوجود جہاں مثنویوں میں خفتگان خاک سے استفسار ، سید کی لوح تربت ، بلال ، داغ ، صقلیہ ، بلاد اسلامیہ ، گورستان شاہی ، فلسفۂ غم ، والدہ مرحومہ کی یاد میں ، ساقی نامہ ،

پیر و مرید اور ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام ، ایسی نظمیں شامل ہیں وہاں ترکیب بندوں میں تصویر درد ، شمع و شاعر ، خضر راہ ، طلوع اسلام ، مسجد قرطبہ ، ذوق و شوق ، جاوید سے ، ابلیس کی مجلس شوریٰ اور مسعود مرحوم ایسا کلام شامل ہے ۔ ظاہر ہے کہ مسجد قرطبہ اور ذوق و شوق کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ مثنویوں میں ساقی نامہ کے علاوہ اور کسی نظم کو حاصل نہیں ہوئی ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ والدۂ مرحومہ کی یاد میں اور گورستان شاہی کا رتبہ کم ہے ۔

یہاں مثنوی کے بارے میں ایک بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مثنوی کے لیے اگرچہ مقررہ اوزان نہیں ہیں لیکن مروجہ اوزان ضرور ہیں اور مروجہ اوزان سے ہٹ کے کسی اور بحر میں کہی ہوئی مثنویوں کو اہل نظر نے بالعموم اونچا مقام نہیں دیا ۔ منقبط کی مثنوی شاہنامۂ اسلام ادبی محاسن سے لبریز ہے لیکن چونکہ بحر تروج مثمن سالم میں ہے اس لیے اسے نقادوں نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان یا دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم کا مرتبہ نہیں دیا ۔

جہاں تک اقبال کا تعلق ہے اُنہوں نے طویل فارسی مثنویوں مثلاً اسرار خودی ، رموز بے خودی ، گلشن راز جدید ، بندگی نامہ ، مسافر اور پس چہ باید کرد اے اقوام شرق وغیرہ میں اس رواج کی پابندی کی ہے لیکن مختصر مثنویوں میں خواہ وہ فارسی میں ہوں خواہ اُردو میں ، انہوں نے اس پابندی کو پیش نظر نہیں رکھا ۔ اُردو کلام کی بات یہ ہے کہ ساقی نامہ ، پیر و مرید اور ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام تو مثنوی کی مروجہ بحروں میں ہیں لیکن باقی مثنویاں غیر مروجہ بحروں میں ہیں ۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ان مثنویوں کو جو مثنوی کی مروجہ بحروں میں ہیں اونچے پائے کی شاعری ہونے کے باوجود اہل نظر نے مثنویوں کے زمرے میں شامل نہیں کیا اور اقبال کی اُردو مثنویوں کا ذکر جب بھی آیا والدہ مرحومہ کی یاد میں یا گورستان شاہی کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ ساقی نامہ ، پیر و مرید ، اور ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام ہی کو در خور اعتنا سمجھا گیا ۔ اور پھر ان مثنویوں کی ایک خصوصیت اور بھی ہے کہ اقبال نے چند اشعار کے بعد ٹیپ کا شعر لا کر انھیں مختلف بندوں میں تقسیم کر دیا ہے حالانکہ مثنوی اس طرح کے ضابطے سے بے نیاز ہوتی ہے ۔ کہیں کہیں اقبال کا یہی رویہ ترکیب بند کی جانب بھی رہا

ہے ۔ اب ضابطہ تو یہ کہتا ہے کہ ترکیب بند کے ہر بند میں اشعار کی تعداد یکساں ہو لیکن اقبال نے اس ضابطے سے کہیں کہیں انحراف کیا ہے ۔ مثلاً "سیر فلک" ایک چھوٹا سا ترکیب بند ہے جو صرف دو بندوں پر مشتمل ہے ۔ اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے بند میں چار شعر ہیں اور دوسرے میں دس ۔

مثنوی کی غیر مروجہ بحروں میں مثنوی لکھنے اور انہیں کہیں کہیں مختلف بندوں میں تقسیم کر دینے سے یا ترکیب بند کے مختلف بندوں میں تعداد اشعار میں کمی بیشی کرنے سے اقبال کے شاعرانہ مزاج کا ایک نمایاں پہلو ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ روایت کا احترام اور روایت سے بغاوت کا ایک حسین امتزاج اقبال کے احساس میں موجود ہے۔ اس طرح کی بغاوت اقبال نے صنف غزل میں بھی کی ہے مثلاً اُنھوں نے ضابطے کے خلاف کہیں کہیں غزل کو ٹیپ کے شعر پر ختم کیا ہے لیکن چونکہ اقبال کی غزل پر بات چیت اس مقالے کے اسکوپ سے باہر ہے اس لیے اس بحث کو میں آگے نہیں بڑھاؤں گا ۔

قطعے کا ذکر آ گیا ہے تو اس سلسلے میں دو ایک باتیں اور بھی کہنا چاہوں گا ۔ اقبال نے کہیں تو اپنے قطعے پر عنوان کے طور پر لفظ قطعہ ہی لکھا ہے اور اس طرح کے تمام قطع مطلع کے بغیر شروع ہوتے ہیں ۔ کہیں عنوان کے طور پر لفظ قطعہ نہیں لکھا لیکن اس طرح کی بعض منظومات بھی ہیں قطعات بھی ۔ یہ اور بات ہے کہ یہ منظومات خاصے طویل قطع ہیں اور کہیں کہیں یہ منظومات مطلع سے شروع ہو جاتی ہیں ۔ گویا ان قطعات کے مطالعے سے بھی مزاج اقبال کا وہی پہلو سامنے آتا ہے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں یعنی بیک وقت روایت کا احترام اور روایت سے بغاوت ۔ اقبال نے اوزان اور بحر میں تحریف نہیں کی 'نظم آزاد' نظم معرا یا نثری نظم نہیں کہی لیکن مختلف اصناف کے تعلق سے مروجہ اور مسلمہ ضابطوں کی پابندی نہ کرکے اور بعض اصناف کو اپنے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھال کر نئی نسل کو یقیناً اوزان اور بحر میں تحریف کرنے کا رستہ دکھایا ہے ۔

قطع کے ذکر میں ایک عام غلطی کی جانب اشارہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ۱۵ ستمبر ۱۹۰۱ کے "کشمیری گزٹ" میں کشمیر ہی کے متعلق اقبال کے آٹھ قطعات شائع ہوئے ۔ مولوی محمد

دین فوق نے اُنھیں رباعیات کا عنوان دیا ۔ ممکن ہے وہ رباعی اور قطعے کا فرق نہ جانتے ہوں ۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ علامہ اقبال نے خود بھی اُن کی اس غلطی کی نشان دہی نہیں کی کیونکہ اُس صورت میں ''کشمیری گزٹ'' کے بعد کے شمارے میں اس غلطی کی تصحیح ہو جاتی ۔ خیر علامہ اقبال تو بے نیاز آدمی تھے اُنھوں نے اس بات کا خیال ہی نہیں کیا ہو گا ۔ زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ عبداللہ قریشی اور صادق علی دلاوری نے بھی اور سرود رفتہ میں غلام رسول مہر نے بھی ان قطعات کو رباعیات ہی کہا ہے ۔

جب میں اصناف سخن میں اقبال کی تحریفات کا ذکر کرتا ہوں تو میری مراد یہ ہرگز نہیں ہوتی کہ اقبال نے قطعے کو رباعی یا رباعی کو قطعہ سمجھا ۔ تحریف یا تصرف کی وضاحت میں اقبال کی ایک متروک نظم کی مثال دے کر کروں گا ۔ متروک نظم کی مثال یہ ظاہر کرنے کے لیے دی جا رہی ہے کہ شروع ہی سے اقبال کا شعور شعر ایک طرح سے بغاوت کی راہ پر چل رہا تھا ، ورنہ اس طرح کی مثالیں بعد کے کلام میں بھی ملتی ہیں ۔ یہاں جس متروک نظم کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس کا عنوان ہے ''منشی محبوب عالم کے سفر یورپ پر'' ۔ اس کا پہلا شعر مثنوی کا ہے ۔

لیجیے حاضر ہے مطلع رنگیں
جس پہ صدقے ہو شاہد تحسیں

اور اس کے فوراً بعد نظم نے ترکیب بند کی صورت اختیار کر لی ہے جو اقبال کی محبوب صنف نظم ہے ۔

یہ غالباً میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ قصیدہ ہیئتی اعتبار سے بھی ایک صنف سخن ہے اور موضوعی اعتبار سے بھی ۔ اقبال نے ساری زندگی میں چار قصیدے لکھے ۔ تین تو موضوعی اور ہیئتی دونوں پہلوؤں سے قصیدے ہیں اور ایک قصیدہ مسدس کے انداز میں ہے ۔ جہاں تک ہیئتی اعتبار سے قصیدے کا تعلق ہے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اقبال کو اس صنف میں بھی وہ قادر الکلامی حاصل ہے جو ہمارے اہم قصیدہ نگار شعرا مثلاً ذوق اور سودا کو حاصل ہے ۔ اس ضمن میں اقبال فارسی شعراء میں بھی بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں ۔ اقبال پتھریلی زمین کو کس طرح پانی کر دیتے

ہیں یہ کمال فن اُن کا صرف اُن کے قصائد ہی میں نظر آتا ہے ۔ اگر اقبال نواب بہاول پور کی شان میں قصیدہ نہ لکھتے تو اُن کے کمال فن کا یہ پہلو قارئین اقبال کی نظر سے پوشیدہ رہتا ۔ اس قصیدے کی ردیف ''زمیں'' ہے اور قافیہ ہے اختر ، مصدر ، گوہر ، اسکندر ، احمر وغیرہ ۔

اڑتالیس اشعار کا یہ قصیدہ ۱۹۰۳ کا ہے جب کہ ابھی اقبال کی شاعری کی ابتدا تھی ۔ غلام رسول مہر "سرود رفتہ" میں لکھتے ہیں :-

نومبر ۱۹۰۳ میں رکن الدولہ ، نصرت جنگ مخلص الدولہ حافظ الملک ہز ہائی نیس نواب محمد بہاول خان پنجم عباسی کو والسرائے نے خود اپنے ہاتھوں سے مسند سلطنت پر بٹھایا اور زمام اختیارات اُن کے ہاتھ میں دی۔ اس خوشی کی تقریب میں جو جشن ریاست میں منایا گیا وہ مدتوں یادگار رہے گا ۔ چونکہ ہزہائی‌نیس کے والد ماجد اس زمانے میں وفات پا گئے تھے جب ہزہائی‌نیس کا سن مبارک بلوغ کو نہ پہنچا تھا اس لیے ریاست میں انتظام کونسل آف ریجینسی کے ذریعے سے جاری رہا ۔ اختیارات حکومت ملنا ریاست کی تاریخ میں بہت بڑا واقعہ تھا اس لیے روسائے عالی تبار اور راجگان ذیشان کے علاوہ ہر فرقے اور طبقے کے منتخب لوگ بھی اس تقریب سعید میں شامل تھے ۔ اقبال سے قصیدے کی فرمائش کی گئی اور اُنھیں بطور خاص اس تقریب میں بلایا گیا تھا لیکن وہ رخصت نہ ملنے کے باعث جا نہ سکے ۔ قصیدہ نومبر ۱۹۰۳ء کے "مخزن" میں شائع ہوا تھا ۔ آخر میں حکمرانی کا صحیح خاکہ پیش کیا ہے ۔

یہ قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے ۔

بزم انجم میں ہے گو چھوٹا سا اک اختر زمیں
آج رفعت میں ثریا سے بھی ہے اوپر زمیں
اوج میں بالا فلک سے مہر سے تنویر میں
کیا نصیبہ ہے رہی ہر معرکے میں سر زمیں
انتہائے نور سے ، ہر ذرہ اختر خیز ہے
مہر و ماہ و مشتری صیغے ہیں اور مصدر زمیں
لے کے پیغام طرب جاتی ہے سوئے آسماں
اب نہ ٹھہرے گی کبھی اطلس کے شانوں پر زمیں
شوق بک جانے کا ہے فیروزہ گردوں کو بھی
مول لیتی ہے لٹانے کے لیے گوہر زمیں

یہ تشبیب کے اشعار ہیں ۔ اب گریز کا حصہ دیکھیے

چاندنی کے پھول پر ہے ماہ کامل کا سماں
دن کو ہے اوڑھے ہوئے مہتاب کی چادر زمیں
آسماں کہتا ہے ظلمت کا جو ہو دامن میں داغ
دھووے پانی چشمۂ خورشید سے لے کر زمیں

گریز کے بعد حسب دستور مدح کے اشعار ہیں

چومتی ہے دیکھنا جوش عقیدت کا کمال
پائے تخت یادگار عم پیغمبر زمیں
زینت مسند ہوا عباسیوں کا آفتاب
ہو گئی آزاد احسانِ شہ خاور زمیں
یعنی نواب بہاول خاں ، کرے جس پر فدا
بحر موتی ، آسماں انجم ، زر و گوہر زمیں
جس کے بد خواہوں کی شمع آرزو کے واسطے
رکھتی ہے آغوش میں صد موجۂ صرصر زمیں
جس کی بزم مسند آرائی کے نظارے کو آج
دل کے آئینے کو لائی دیدۂ جوہر زمیں
جس کی راہ آستاں کو حق نے وہ رتبہ دیا
کہکشاں اس کو سمجھتا ہے فلک ، محور زمیں

اب ان مدحیہ اشعار کے ساتھ ہی ایک بند ختم ہوتا ہے ۔ ان دو شعروں پر

جس کے ثانی کو نہ دیکھے مدتوں ڈھونڈے اگر
ہاتھ میں لے کر چراغ لالۂ احمر زمیں
وہ سراپا نور اک مطلع خطابیہ پڑھوں
جس کے ہر مصرعے کو سمجھے مطلع خاور زمیں

اور وہ مطلع یہ ہے

اے کہ فیض نقش پا سے تیرے گل بر سر زمیں
اے کہ تیرے دم قدم سے خسرو خاور زمیں

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

اور اس بند میں اقبال پند و نصائح سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں

ہو ترا عہد مبارک صبح حکمت کی نمود
وہ چمک پائے کہ ہو محسود ہر اختر زمیں
سامنے آنکھوں کے پھر جائے سماں بغداد کا
ہند میں پیدا ہو پھر عباسیوں کی سر زمیں
محو کر دے عدل تیرا آسمان کی کجروی
کجّیات دہر کے حق میں بنے مسطر زمیں
صلح ہو ایسی گلے مل جائیں ناقوس و اذاں
ساتھ مسجد میں رکھے بت خانۂ آزر زمیں
نام شاہنشاہ اکبر زندۂ جاوید ہے
ورنہ دامن میں لیے بیٹھی ہے سو قیصر زمیں
بادشاہوں کی عبادت ہے رعیت پروری
ہے اسی اخلاص کے سجدے سے قائم ہر زمیں
ہے مروت کی صدف میں گوہر تسخیر دل
یہ گہر وہ ہے کرے جس پہ فدا کشور زمیں
حکمراں مست شراب عیش و عشرت ہو اگر
آسماں کی طرح ہوتی ہے ستم پرور زمیں
عدل ہو مالی اگر اس کا یہی فردوس ہے
ورنہ ہے مٹی کا ڈھیلا، ''خاک کا'' پیکر زمیں

پند و نصائح کے بعد قصیدے کا دعائیہ حصہ آتا ہے جس میں اقبال لکھتے ہیں

لا مکاں تک کیوں نہ جائے گی دعا اقبال کی
عرش تک پہنچی ہے جس کے شعر کی اڑ کر زمیں
خاندان تیرا رہے زیبندۂ تاج و سریر
جب تلک مثل تمر کھاتی رہے چکر زمیں
مسند احباب رفعت سے ثریا بوس ہو
خاک رخت خواب ہو اعدا کا اور بستر زمیں
تیرے دشمن کو اگر شوق گل و گلزار ہو
باغ میں سبزے کی جا پیدا کرے نشتر زمیں
ہو اگر پنہاں تری ہیبت سے ڈر کر زیر خاک
مانگ کر لائے شعاع مہر سے خنجر زمیں

اب دیکھیے قصیدے کے تمام لوازم اس قصیدے "دربار بہاول پور" میں جمع ہیں ۔ تشبیب بھی ہے ، گریز بھی ، مدح بھی ، پند و نصائح بھی اور دعا بھی لیکن ایک شے اگر نہیں ہے تو وہ قصد ہے ۔ قصیدے میں یا اپنی زندگی میں اس طرح کا قصد جو قصیدے کا جزو لاینفک ہے اقبال کے درویشانہ مزاج سے ہم آہنگی نہیں رکھتا اور اسی قصیدے میں بھی فقدان قصد اُس قصیدے کا شاعرانہ مرتبہ بلند تر کر دیتا ہے ، اور اسی فقدان اشعار قصد میں اقبال کے نظریہ فن پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اصناف نظم کی جانب اُن کے رویے پر بھی ۔ یہ قصیدہ ان اشعار پر ختم ہوتا ہے -

پاک ہے گرد غرض سے آئنہ اشعار کا
جو فلک رفعت میں ہو لایا ہوں وہ چن کر زمیں
تھی تو بہتر ہی مگر مدحت سرا کے واسطے
ہو گئی ہے گل کی پتی سے بھی نازک تر زمیں

جہاں اول الذکر شعر دعویٰ اور دلیل دعویٰ کی ایک جامع تصویر پیش کرتا ہوا ہمیں غنی کاشمیری کے تغزل کی یاد دلا جاتا ہے وہاں ثانی الذکر شعر جو اس قصیدے کا آخری شعر ہے صنعت تضاد کی ایک خوبصورت مثال ہے ۔ واضح رہے کہ قصیدے کے حسن کو فروغ صنائع بدائع ہی سے ملتا ہے ۔ یہ اور اس طرح کے تمام محاسن اس قصیدے میں جمع ہیں اور اگر نہیں ہے تو صرف قصد یا غرض کا شعر اور اقبال کا شاعرانہ مزاج اس امر کا متقاضی ہے کہ قصیدے کے ایک اہم جزو کو قصیدے سے خارج کرنا منظور لیکن اپنے نظریۂ حیات کو مجروح کرنا منظور نہیں اور یہی شاعر اقبال کی شان جدت بھی ہے ، شان بغاوت بھی اور شان قلندری بھی ۔

اسی طرح اپنے دوست مہاراجہ سر کشن پرشاد مدار المہام ریاست حیدر آباد کی شان میں قصیدہ لکھتے ہوئے جہاں یہ کہتے ہیں

اس قدر حق نے بنایا اُس کو عالی مرتبت
آسماں اُس آستانے کی ہے اک مشت غبار
کی وزیر شاہ نے وہ عزت افزائی مری
چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار
مسند آرائے وزارت ، راجہ کیواں حشم
روشن اُس کی رائے روشن سے نہ لوح روزگار

اُس کی تقریروں سے روشن گلستان شاعری
اُس کی تحریروں پہ نظم مملکت کا انحصار
لیلی معنی کا محمل اُس کی نثر دلپذیر
نظم اُس کی شاہد راز ازل کی پردہ دار
اُس کے فیض پا کی منت خواہ کان لعل خیز
بحر گوہر آفریں دست کرم سے شرمسار
سلسلہ اُس کی مروت کا یونہی لا انتہا
جس طرح ساحل سے عاری بحر نا پیدا کنار
دل ربا اُس کا تکلم ، خلق اُس کا عطر گل
غنچہ و گل کے لیے موج نفس باد بہار
ہو خطا کاری کا ڈر ایسے مدبر کو کہاں
جس کی ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار
ہے یہاں شان امارت پردہ دار شان فقر
خرقۂ درویشی کا ہے زیر قبائے زرنگار
خاکساری جوہر آئینۂ عظمت بنی
دست وقف کار فرمائی و دل مصروف یار
نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پہ کیا
محو کر سکتا نہیں جس کو مرور روز گار

وہاں یہ قصیدہ اس شعر پر ختم کرتے ہیں

شکریہ احسان کا اے اقبال لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شمار

اب یہ جو روایت سے بغاوت کی بات میں نے کی ہے یا یہ کہا ہے کہ اقبال نے مختلف اصناف نظم میں تحریف اور تصرف کرکے اپنے بعد آنے والے شعراء کو شاعری کے نئے رستوں سے آشنا کیا ہے تو اس کی ایک مثال اُس قصیدے میں بھی نظر آتی ہے جو اقبال نے ۱۹۰۲ء میں پنجاب کے لفٹینٹ گورنر سر ولیم میکورتھ ینگ اور ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ولیم بل کے اعزاز میں پڑھا ۔ یہ قصیدہ اُنھوں نے اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ انجمن حمایت اسلام کے لیے لکھا اور مقصد اقبال کا یہ تھا کہ تاج برطانیہ کے ان نمائندوں کی تشریف آوری سے انجمن حمایت اسلام کو فائدہ پہنچے ۔

چنانچہ اس قصیدے میں کہتے ہیں ۔

مدد جہان میں کرتے ہیں آپ ہم اپنی
غریب دل کے ہیں لیکن مزاج کے ہیں امیر
مگر حضور نے ہم پر کیا ہے وہ احسان
کہ جس کے ذوق سے شیریں ہوا لب تقریر
عجب طرح کا نظارا ہے اپنی محفل میں
کہ جس کے حسن پہ نازاں ہے خامۂ تحریر
خوشا نصیب کہ یہ ہمرہ حضور آئے
ہماری بزم کی یک بار بڑھ گئی توقیر

اور وہ جو میں نے ''پنجاب کا جواب'' کا ذکر کیا ہے اور جو اس بند پر ختم ہوتا ہے ۔

جب تک چمن کی جلوۂ گل پر اساس ہے
جب تک فروغ لالۂ احمر لباس ہے
جب تک نسیم صبح عنادل کو راس ہے
جب تک کلی کو قطرۂ شبنم کی پیاس ہے
قائم رہے حکومت آئیں اسی طرح
دبتا رہے چکور سے شاہیں اسی طرح

تو اس کا دوبارہ ذکر یہاں اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ فارسی یا اُردو میں غالباً واحد قصیدہ ہے جو مسدس کے انداز میں لکھا گیا ہے اور جو اقبال کی جدت پسندی کی دلیل ہے ۔

قصیدے کے ساتھ ہی مرثیے کا ذکر بھی نا گزیر معلوم ہوتا ہے ۔ فارسی شاعری میں مرثیے بالعموم ترکیب بند کے انداز میں لکھے گئے ہیں یا ترجیع بند کے انداز میں ۔ ترجیع بند تو خیر اقبال کے یہاں سرے سے معدوم ہے اور میری ناقص رائے میں اس کا جو سبب ہو سکتا ہے وہ اسی مقالے میں اپنے صحیح مقام پر میں عرض کر دوں گا ۔ یہاں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ انیس نے مرثیے کو مسدس کا لباس پہنا کر مرثیے کے موضوع اور مسدس کو یک جان کر دیا ہے ۔ اقبال نے اس ضمن میں میر انیس کی پیروی نہیں کی ۔ اول تو اقبال کے یہاں مرثیے کم تعداد میں ہیں لیکن اگر ہم 'گورستان شاہی' فلسفہ غم ، اور بلاد اسلامیہ کو بھی

مرثیے کی صنف میں شامل کریں (جو شاید مناسب نہ ہو) تو بھی تعداد کوئی زیادہ نہیں بنتی لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ اقبال نے کوئی مرثیہ مسدس کے انداز میں نہیں لکھا ۔ یا تو یہ مثنوی کی صورت میں ہیں یا قطعے کے انداز میں اور یا ترکیب بند کے پیکر میں ۔ اور اس سے جو نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ اُردو میں مرثیہ گوئی کی جو روایت قائم تھی اقبال نے اُس کی پیروی کرنا پسند نہیں کیا ۔ یہاں اپنے نقطہ نگاہ کی وضاحت کے لیے میں اقبال ہی کے دو شعر پیش کرنا چاہوں گا

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اُس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوھر ہے یگانہ

میں نے شروع میں اُن اصناف سخن کی نشان دہی کرتے وقت جن میں اقبال نے اپنا کلام ہمیں دیا ہے تاریخ گوئی کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ معلوم نہیں تاریخ گوئی کوئی الگ صنف سخن ہے یا نہیں لیکن اقبال کا کلام اس صنف سے بھی خالی نہیں ۔ اور اگرچہ اس صنف میں اقبال نے کسی ایسی تحریف یا تصرف سے کام نہیں لیا جس سے اُنھوں نے مثنوی، ترکیب بند، قصیدے اور مرثیے میں لیا ہے لیکن فن تاریخ گوئی میں اُنھیں جو ید طولیٰ حاصل تھا اُس کی مثال اقبال کے ہمعصروں یا اقبال کے بعد آنے والے شاعروں کے یہاں بہت کم ملے گی ۔ در اصل اقبال نے زیادہ تر تاریخیں فارسی شعر میں نکالیں ۔ عربی میں بھی اُنھوں نے مادہ ہائے تاریخ نکالے لیکن شاید ایک دو سے زیادہ نہیں ۔

اقبال کی مزاحیات سب کی سب قطعے کے انداز میں ہیں ۔ "بانگ درا" کے مزاحیہ قطعات تو ہم سب کے سامنے ہیں لیکن متروک کلام کے تمام قطعات ہمارے سامنے نہیں ہیں ۔ ان میں سے ایک قطعہ میں تفنن طبع کی خاطر یہاں پیش کر رہا ہوں ۔

ھند کی کیا پوچھتے ہو اے حسینان فرنگ
دل گراں، ہمت سبک، ووٹر فزوں، روزی تنگ
بے ٹکٹ، بے پاس بھارت کی سیاسی ریل میں
ہو گیا آخر مسیتا بھی سع اصحاب بک

"لٹک ودِن" کا حکم تھا اس بندۂ اللہ کو
اب یہ سنتے ہیں نکلنے کو ہے مسلم آؤٹ لُک
کیا عجب پہلے ہی لیڈر میں یہ کر دے آشکار
کس طرح آیا کو لے کر اُڑ گیا صاحب کا کُک
ختم تھا مرحوم اکبر ہی پہ یہ رنگ سخن
ہر سخن ور کی یہاں طبع رواں جاتی ہے رک
قافیہ اک اور بھی اچھا تھا لیکن کیا کریں
کر دیا متروک دلی کے زباں دانوں نے ٹک

اب میں اُس بحث کا جو میں نے درمیان میں نا مکمل چھوڑ دی تھی دوبارہ یہاں ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ "جواب شکوہ" کے بعد اقبال نے مسدس کی طرف رجوع نہیں کیا اور اپنے شاہکار ہمیں ترکیب بند کی صورت میں دیتے ہیں۔ اب اس رجحان طبع کا قطعی طور پر کوئی سبب بتانا تو مشکل ہے لیکن اس کا جو سبب سامنے آ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک تو مسدس کو میر انیس نے انتہائی بلندی پر پہنچا دیا تھا۔ ممکن ہے اقبال نے یہ سوچا ہو کہ اب میر انیس سے آگے مسدس کو لے جانا آسان نہیں اور دوسری بات جو شاید کچھ زیادہ وزن دار ہو یہ ہے کہ مسدس کے ہر بند کے تین اشعار میں ایک ہی بات بیان کی جاتی ہے۔ گویا مسدس میں ایک خیال کو بہر صورت تین اشعار تک پھیلانا ضروری ہے اور جس طرح رباعی کی تان چوتھے مصرعے پر آ کر ٹوٹتی ہے اسی طرح مسدس کے ہر بند کی تان اُس کے ٹیپ کے شعر پر آ کر ٹوٹتی ہے۔ میر انیس نے اپنے کمال فن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بلاوجہ نہیں کہا تھا کہ

اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں،

اور میر انیس نے واقعی اک پھول کے مضمون کو جس طرح سو رنگ سے باندھا ہے اُس کی مثال اُردو شاعری میں نہیں ملتی، جوش ملیح آبادی کے کلام کو چھوڑ کر، لیکن اقبال کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے نہیں باندھتے بلکہ سو رنگوں کو ایک رنگ میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ تمام رنگ اپنی اپنی جھلک دکھانے کے باوجود ایک اکائی کی صورت میں ہمارے سامنے رہتے ہیں۔ اقبال محض حسن

کے لیے الفاظ کا جادو نہیں جگاتے ۔ وہ ایک بات سو طرح سے نہیں کہتے بلکہ قلیل الفاظ میں کثیر معانی پیدا کرتے ہیں ۔ غالباً اُنھوں نے چند مسدس لکھ کر اس راز کو پا لیا تھا کہ اگرچہ اُنہیں مسدس پر قابل رشک دسترس حاصل ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض دفعہ مسدس کے ہر مصرعے میں ایک ہی بات کو اور ایک ہی خیال کو دہرانا پڑتا ہے ۔ مثال کے طور پر اقبال کا یہ مسدس دیکھئے

تلوار تیری دہر میں نقاد خیر و شر
بہروز ، جنگ توز، جگر سوز ، سینہ در
رایت تری سپاہ کا سرمایۂ ظفر
آزادہ ، پر کشادہ ، پری زادۂ، یم سپر
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے

آزادیٔ زبان و قلم ہے اگر یہاں
سامان صلح دیر و حرم ہے اگر یہاں
تہذیب کاروبار اُمم ہے اگر یہاں
خنجر میں تاب، تیغ میں دم ہے اگر یہاں
جو کچھ بھی ہے عطائے شہ محترم سے ہے
آبادیٔ دیار ترے دم قدم سے ہے

ہندوستان کی تیغ ہے فتاح ہشت باب
خونخوار، لالہ بار، جگر دار، برق تاب
بے باک، تابناک، گہر پاک بے حجاب
دل بند ، ارجمند ، سحر خند ، سیم تاب
یہ تیغ دلنواز اگر بے نیام ہو
دشمن کا سر ہو اور نہ سودائے خام ہو

آج اگر میر انیس ہوتے تو اس بند کی داد دیتے اور اسی لیے داد دیتے کہ اقبال نے ایک ہی بات کو چودہ بار بیان کیا ہے اور خالص شاعرانہ انداز بیان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔ لیکن یہ انداز بیان اقبال کے مزاج کے ساتھ لگا نہیں کھاتا ۔ یہ ایک پھول کو سو رنگ سے باندھنے کی بات

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

اقبال کے دل کو نہیں لگتی ۔ اقبال تو جب منظر نگاری بھی کرتے ہیں تو ایک بات کہہ کے اُسے پھر نہیں دہراتے اور بات کو محض حسن بیان کی خاطر نہیں بڑھاتے ۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ کے

وادیٔ کہسار میں غرق شفق ہے سحاب
لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

یا

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

کہہ کے آگے بڑھ جاتے ہیں ، عظیم خیالات کو خالص شاعری بناتے چلے جاتے ہیں اور جو بات کہنا ہوتی ہے وہ کہہ کے اپنی نظم ختم کرتے ہیں ۔ منظر نگاری اقبال منظر نگاری کے لیے نہیں کرتے بلکہ اپنی بات کہنے کے لیے منظر نگاری سے ماحول آفرینی کا کام لیتے ہیں اور یہ کرشمہ مسدس کے ذریعے سے نہیں ، مثنوی یا ترکیب بند کے ذریعے سے رونما ہو سکتا ہے۔

یہی بات مجھے ترجیع بند کے بارے میں کہنا ہے ۔ ترجیع بند میں ہر بند کے بعد اُسی شعر کا آ جانا اسی لیے اقبال کے نزدیک معیوب ٹھہرا کہ ایک کہی ہوئی بات کو اُنھی الفاظ میں دوبارہ کیوں کہا جائے ۔

اب اقبال کی مثنوی اور ترکیب بند کے بارے میں ایک آدھ بات اور کہنا چاہوں گا اور وہ بھی محض اپنے اس نقطے پر زور دینے کے لیے کہ اقبال نے اصناف نظم کے مروجہ ضابطوں کی جس قدر پابندی کی ہے اُتنا ہی اُن سے انحراف بھی کیا ہے ۔

''ستارہ'' ایک چھوٹا سا ترکیب بند ہے ، صرف آٹھ شعر پر مشتمل ۔ یہ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ اگر ترکیب بند کے صرف ایک ہی بند کو ترکیب بند کہا جا سکتا ہے تو اقبال کے یہاں کتنے ہی قطعات ہیں جو ترکیب بند کے انداز سے شروع ہوتے ہیں اور اگر ان میں ایک ایک بند اور ہوتا تو ہم انہیں ترکیب بند کی ذیل میں رکھ سکتے تھے ۔ مثلاً نظم ''دل'' کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے ۔ یہ ایک ترکیب بند ہی کا حصہ ہے لیکن چونکہ اس نظم میں سے اقبال نے یہی ایک بند ہی منتخب کیا اور باقی قلمزد کر دیئے اس لیے ضابطے کے تحت یہ ترکیب بند نہ رہا ورنہ مجھے اسے ترکیب بند کہنے میں کوئی تامل نہیں ۔

"بزم انجم" بھی ترکیب بند ہے لیکن اسی صنف سخن کے تحت آنے والی اکثر نظموں کی طرح اس نظم میں یہ پابندی نہیں کی گئی کہ ہر بند میں اشعار کی تعداد یکساں ہو۔

اگر صرف "بانگ درا" کی نظموں کو پیش نظر رکھا جائے اور چھوٹے چھوٹے ترکیب بندوں کو جو دس دس بارہ بارہ اشعار پر مشتمل ہیں نظر انداز کر دیا جائے تو "تصویر درد" پہلا ترکیب بند ہے جو بالالتزام ترکیب بند کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اگر متروک کلام کو بھی سامنے رکھیں تو اس سے پہلے چھ طویل ترکیب بند موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صنف اقبال کی خاصی محبوب صنف رہی ہے۔

مخمس، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اقبال کے یہاں صرف دو ہیں۔ ایک "بانگ درا" میں دوسرا "بال جبریل" میں۔ اب تعداد کے پیش نظر تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مخمس اقبال کی محبوب صنف نظم ہے لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ انھی دو میں ایک میخانۂ الہام کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ مخمس یہ ہے

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بیتاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو اصناف نظم اردو میں نایاب یا کمیاب ہیں، اقبال نے انھیں بھی ہاتھ لگایا ہے مثلاً مثلث اور سبع۔ اول الذکر کی ایک مثال "ابھی سینا" ہے اور ثانی الذکر کی "حسن و عشق"۔

تضمین میں اقبال نے اپنی جودت طبع کا اظہار کیا ہے یعنی کہیں تو اس مروجہ طریقے کی پیروی کی ہے کہ نظم یوں شروع کی

خوب ہے تجھ کو شعار صاحب یثرب کا پاس
کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں

اور آخر میں ابو طالب کلیم کا یہ شعر آ گیا

سرکشی با ہر کہ کردی رام او باید شدن
شعلہ ساں از ہر کجا برخاستی آنجا نشیں

اور کبھی اس مروجہ طریقے سے یوں انحراف کیا کہ جو شعر تضمین کے لیے چنا اُس کے پہلے مصرعے کی تضمین کی۔ مثلاً

کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی
صدا تربت سے آئی شکوۂ اہل جہاں کم گو
نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

اگرچہ اقبال نے گیت کی صنف کو نہیں اپنایا لیکن جہاں تک اُن کے کلام کے صوتی آہنگ کا تعلق ہے وہ اول سے آخر تک ایک گیت ہی کی دلکشی رکھتا ہے۔ خیر اس بات سے قطع نظر، اگر اقبال کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو ایسی نظموں کا سراغ مل جاتا ہے جو گیت کے مزاج کی پرورش کر رہی ہیں اور جن سے گیت کے دھارے پھوٹتے نظر آتے ہیں مثلاً ایک تو ہے ''او غافل افغان'' جس کی زبان گیت کی زبان سے زیادہ قریب ہے بہ نسبت اقبال کی زبان سے۔ سرور صاحب کا کہنا ہے کہ اگر اقبال کے نزدیک یہ گیت نہ ہوتا تو یہ مصرع اس نظم میں نہ آتا

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا

سرور صاحب کا یہ نکتہ خاصا وزن دار ہے لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی اضافہ کروں گا کہ اپنے بچپن میں پشتو کا ایک گیت ہم پٹھانوں کی زبان سے سنا کرتے تھے اور اُس گیت کا پیٹرن بالکل یہی ہوتا تھا جو اپنی خودی پہچان کا ہے۔ فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعل کے دو مصرعوں کے بعد دو مصرعے فعلن، فعلن فعل کے۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اس گیت کو 'وا قربان' کہا جاتا تھا غالباً اقبال افغانوں سے خطاب کرتے ہوئے وا قربان سے خالی الذہن نہیں رہے ہوں گے۔

جب ہم گیت کا ذکر کرتے ہیں تو خیال "اے وادی لولاب" کی جانب بھی جا نکلتا ہے جس میں ہر دو مصروں کے بعد "اے وادی لولاب" کا ٹکڑا آتا ہے۔

گیت نما نظموں یا گیتوں کی مثالیں فارسی شاعری میں زیادہ ہیں لیکن اقبال کی فارسی شاعری چونکہ اس مقالے کے احاطے سے باہر ہے اس لئے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا ہے۔

''بانگ درا'' کی نظم ''حسن و عشق'' کو بھی اسی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے جب چھے مصرعوں کے بعد ایک تنہا مصرع بند کو مکمل کرتا ہے اور اس مصرعے کی بدولت اس نظم کا آہنگ گیت کے ساتھ جا ملتا ہے۔

ایک اور صنف جسے ہم تمثیلی نظم کہتے ہیں اقبال کے ہاتھ میں آ کر خوب پھلی پھولی۔ ان نظموں کے مکالماتی پہلو نے اُردو شاعری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ جہاں تک ان نظموں کا تعلق ہے اقبال نے کہیں تو ایک ہی بحر کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا جیسے 'تقدیر' (ابلیس ویزداں) یا جبریل و ابلیس، یا ابلیس کی مجلس شوریٰ، اور کہیں مختلف کرداروں کے لیے مختلف بحریں استعمال کرکے موسیقی کا جادو جگایا جیسے ''عالم برزخ''

'فقر' ایک ایسا چھوٹا سا قطعہ ہے جسے ہم مسدس بھی کہہ سکتے ہیں اور مثنوی بھی۔ اس میں چھے مصرعے ہیں مقفیٰ (اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری)۔ ضرب کلیم میں بھی اس طرح کی مثالیں ہیں مثلاً ''جدت'' اور ''رومی''۔

میں نے اس مقالے کے شروع میں اقبال کی مثنوی کے متعلق یہ کہا ہے کہ ایک تو اقبال نے اکثر عظیم مثنویاں مثنوی کی بحروں میں نہیں لکھیں دوسرا اُنھیں ضابطے کے خلاف مختلف بندوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

اقبال نے جب طویل مثنویاں کہیں فارسی میں مثلاً اسرار و رموز، گلشن راز جدید، بندگی نامہ، جاوید نامہ، مسافر اور پس چہ باید کرد اے اقوام شرق یا اُردو میں ساقی نامہ تو اس صنف کی مروجہ بحروں میں کہیں لیکن جب اُنھوں نے مروجہ بحروں سے انحراف کیا تو یہ اتفاق امر نہیں رہا ہو گا بلکہ اُنھوں نے بالالتزام ایسا کیا ہو گا کیونکہ اس طرح کی تحریف کی مثالیں ایک دو نہیں ہیں، بہت ہیں۔ مثلاً "رات اور شاعر" ایک

مکالمہ ہے رات اور شاعر کے درمیان ۔ اس نظم کے دونوں حصے دو الگ الگ بحروں میں ہیں ۔ رات یوں بات کرتی ہے ۔

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں

اور شاعر یوں جواب دیتا ہے

میں ترے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں

''غرہ شوال'' یا ''ہلال عید'' مثنوی کے انداز میں شروع ہوئی ۔ پہلا بند مثنوی ہے لیکن دوسرے بند میں شاعر کی طبیعت ترکیب بند کی جانب چل نکلی ۔ ''انسان'' ایک ایسی مثنوی ہے جس کے شروع میں صرف ایک مصرع ہے ۔ قدرت کا عجیب ستم ہے ۔ اور یہ کوئی ضمنی عنوان نہیں ہے بلکہ باقاعدہ نظم کا حصہ ہے یعنی یہ نظم اسی مصرعے سے شروع ہو رہی ہے ۔

''فلسفہ غم'' مسدس کے طور پر شروع ہوئی ہے ۔

گو سراپا کیف عشرت ہے شراب زندگی

لیکن پہلے ہی بند کے بعد اس نے مثنوی کی صورت اختیار کر لی ہے اور آخر تک مثنوی کے طور پر چلی ہے ۔ یہ اسی نظم کا آخری شعر ہے جو آج زبان زد خاص و عام ہے

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

اقبال کے یہاں اصناف نظم میں یہ تمام تحریفیں ہمیں شاعری کے متعلق اقبال کے اُس قول کی یاد دلاتی ہیں جس میں وہ کہتے ہیں کہ فن کا مقصد حسن ہے نہ کہ سچائی ۔ لیکن اقبال نے اپنے فن میں سچائی کو صرف برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ شعر کی زبان دیتے وقت اُسے خوبصورت اور دلکش بنانے کی طرف متوجہ رہے ہیں اور اس کے پیش نظر مروجہ اصناف نظم میں طرح طرح کی تبدیلیاں اُنھوں نے کیں ۔ یہ تبدیلیاں جو روایت کے احترام اور روایت سے بغاوت کا ایک حسین امتزاج ہیں انواع میں اتنی زیادہ ہیں کہ ان سے مروجہ بحروں میں تصرف کے نئے جادے کھلتے نظر آتے ہیں اور ان تمام تصرفات اور تحریفات کا جواز اقبال کے ان شعروں میں

موجود ہے۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نور سحر سے
خورشید کرے کسب ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موج گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجاز ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

فارسی کتب

قیمت

۱- تذکرۂ شعرای کشمیر
از میرزا محمد اصلح -/۵۰ روپے

۲- تذکرۂ شعرای کشمیر (جلد اول)
از پیر حسام الدین راشدی -/۵۰ روپے

۳- تذکرۂ شعرای کشمیر (جلد دوم)
از پیر حسام الدین راشدی -/۵۱ روپے

۴- تذکرۂ شعرای کشمیر (جلد سوم)
از پیر حسام الدین راشدی -/۵۱ روپے

۵- تذکرۂ شعرای کشمیر (جلد چہارم)
از پیر حسام الدین راشدی -/۵۰ روپے

۶- تذکرۂ شعرای پنجاب
از لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) خواجہ عبدالرشید -/۵۱ روپے

۷- ضربِ کلیم
مترجمہ: ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی -/۲۲ روپے

۸- اقبال در راہِ مولوی
از ڈاکٹر سید محمد اکرم -/۳۰ روپے

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006